آصف جاہ کے خلاف لشکر کا مشورہ دیا تو وہ فوراً آمادہ ہوگیا اور حسین علی خاں کو ساتھ لے کر تورانیوں کے سردار آصف جاہ کو ختم کرنے کے لئے ایک فوج لے کر دکن کی طرف روانہ ہوا۔ جہاں آصف جاہ نے قبضہ جمالیا تھا مگر دلی سے چند منزل ہی آگے بڑھے تھے کہ آخر جس شاہین بلند آشیانہ کے شکار کے لئے نکلے تھے اس کی دعاہائے نیم شبی یا اس کی حکمت عملی کے شکار ہوگئے۔ آصف جاہ کے بچازاد بھائی امین خاں کے اشارے سے میر حیدر کاشغری نے حسین علی خاں کا کام تمام کردیا۔ سفر میں جب حسین علی خاں کی بارگاہ لوٹی گئی تو طباطبائی کے بیان کے مطابق اس وقت اس کے خزانہ میں ایک کروڑ روپیہ تھا۔ ایک بازو کا ٹوٹنا تھا کہ دوسرا بازو بھی ایرانیوں کا بظاہر ٹوٹ گیا۔ یعنی دو سگے بھائی قطب الملک حسن علی خاں نے محمد شاہ کے ہاتھوں گرفتار ہوکر قید خانے میں اپنی زندگی کی آخری سانسیں لیں۔ تورانی امیروں کی مغل دربار میں یہ بڑی کامیابی تھی۔ محمد شاہ کی جان میں جان آئی۔ آصف جاہ کو دکن سے بلاکر وزیر اعظم بنایا۔ لیکن کچھ ہی دن کے بعد حالات بالکل بدل گئے خودغرض اور جاہ پرست امیروں نے محمد شاہ کو پھر تورانیوں کی بجائے ایرانیوں کے زیر اثر ڈالا۔ بادشاہ نے مذہب نہیں بدلا لیکن مشرب ضرور بدل گیا۔ ابر سیاہ ان کا نقیب قرار پایا عام حکم تھا کہ ادھر ہمالیہ کے دامن سے گھٹا اٹھے، بادل گرجے کہ خیمہ خرگاہ صحرا روانہ ہو ہر طرف۔ ؎

می دید صبح کلبہ بستہ سحاب
الصبوح الصبوح یا اصحاب
ژالہ بارید بر رخ لالہ
المدام المدام یا احباب

کا شور تھا۔ اسی لئے بچارا آخر میں رنگیلے کے نام سے بدنام ہوگیا۔ آصف جاہ دربار کے اس رنگ کو دیکھ کر پھر دکن کی پہاڑیوں اور جنگلوں کی طرف روانہ ہوگئے۔

کہا جاتا ہے کہ ایرانی امراء آصف جاہ کی داڑھی پر فقرے چست کیا کرتے تھے۔ آصف جاہ جب قلعے میں داخل ہوتے تو بڈھا بندر کا فقرہ آپ کی شان میں استعمال کیا جاتا ایک دن جھلا کر آصف جاہ نے کہا مجھے جو چاہو کہہ لو لیکن میری آنکھیں اس دن

کو دیکھ رہی ہیں جب لال قلعے کی دیواروں پر بندر اچھلتے پھریں گے۔ اس کے بعد ہی انہوں نے دربار سے علیحدگی کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔

سکھ تحریک

ایک طرف اندرونی فتنوں سے مغلیہ سلطنت کی بنیادیں ہل چکی تھیں خود شاہ صاحب کے بقول ان حالات کی وجہ سے امور سلطنت میں عظیم انتشار اور بدنظمی تھی۔ دوسری طرف بیرونی سازشیں اور اغیار کی ریشہ دوانیاں تھیں کہ چین سے نہ بیٹھنے دیتی تھیں۔

۱۱۲۲ھ مطابق ۱۷۱۰ء میں جب کہ حضرت شاہ ولی اللہ کی عمر تقریباً ۸ سال کی تھی کہ راجپوت راجاؤں نے اجمیر کے قریب ایک اجتماع میں مغل سلطنت سے بغاوت کا اعلان کیا تھا۔ اور مغلیہ سلطنت کے خلاف کھلم کھلا جنگ کے مصمم ارادے کا اظہار کیا تھا راجپوتوں کی طرح سکھوں نے بندہ کی سرکردگی میں مسلمانوں کو تباہ کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ اور وہ جہاں بھی گئے انہوں نے مسلمانوں کے قتل و غارت کا بازار گرم کیا ۱۱۲۲ھ میں سرہند میں چار روز تک غارتگری اور ظلم و ستم کا دور دورہ رہا مسجدیں گرادی گئیں۔ مسلمانوں کے گھر جلائے گئے عورتوں کی عصمتیں لوٹی گئیں اور مسلمانوں کا خون بہایا گیا سکھ مذہب کے بانی گرو نانک ایک صوفی مشرب بزرگ تھے۔ آپ قصبہ تلونڈی میں جسے اب ننکانہ کہتے ہیں ۱۴۶۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔ گرنتھ صاحب جو سکھوں کی مقدس کتاب ہے اس کے مطالعہ سے صاف طور پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ سکھوں کے مذہب میں اسلامی تصوف کے اجزا بہت کشادگی سے پائے جاتے ہیں گویا یہ کتاب اس روحانی میل جول اور نزدیک تر رشتہ کا اظہار ہے۔ جو سکھ مذہب اور اسلام میں ہے۔ گرو نانک خدا کو ایک مانتے تھے، بت پرستی سے نفور تھے۔ لیکن گورو گوبند کی کوششوں سے اس تحریک نے ایک قطعی سیاسی رنگ اختیار کیا۔ سیر المتاخرین میں ہے۔

گرو گوبند نے اپنے باپ تیغ بہادر کی جگہ بیٹھ کر اپنے فرقہ کے پراگندہ اور منتشر افراد کو آہستہ آہستہ اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ ہتھیار، گھوڑے اور دوسرے جنگی ساز و سامان

بھی فراہم کئے اور اپنے رفقاء میں یہ سب کچھ تقسیم کرنے لگا۔ یوں آہستہ آہستہ اس نے ہاتھ پاؤں نکالنے شروع کئے اور دوڑ دھوپ کی ابتدا کی۔

گرو گوبند سنگھ کے بعد جب بندا نامی شخص سکھوں کا گرو قرار پایا تو اس نے ظلم و ستم انتہا کو پہنچا دیا۔

طبا طبائی کا بیان ہے۔

اہل اسلام کے گاؤں اور آبادیوں پر جہاں کہیں قابو پاتا تھا چڑھ دوڑتا تھا اور باشندوں میں جس کسی کو پاتا باقی نہیں چھوڑتا تھا خواہ وہ چھوٹے کمسن بچے ہی کیوں نہ ہوں۔ قساوت و بطش شدید و جباریت کا یہ عالم تھا کہ حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر کے بچہ کو باہر نکال کر مار ڈالتے تھے؛

طبا طبائی مزید لکھتے ہیں

مذکورہ بالا بندا، بادشاہی فوج کا بہت کم سامنا کرتا تھا۔ بلکہ زیادہ تر گوریلا وار کے طور پر چھپ چھپا کر حملے کرتا تھا اور اطراف و جوانب میں پھرتے ہوئے راہزنی کیا کرتا تھا وہ کبھی ایک جگہ اپنا ٹھکانہ بنا کر نہیں رہتا تھا۔ جہاں کہیں موقع ملتا وہ قتل و غارتگری لوٹ اور مساجد و مقابر کے لوٹنے، ڈھانے اور تباہ و برباد کرنے میں کمی نہیں کرتا۔

حضرت شاہ ولی اللہ نے سکھوں کے مظالم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور بقول مولنا مناظر احسن گیلانی۔ اس وقت حضرت شاہ صاحب جوان ہو چکے تھے۔ اگرچہ سکھوں کے مظالم کی داستان حضرت شاہ ولی اللہ[7] کے دور حیات سے بہت طویل ہے۔ لیکن ہم اس مضمون کو حضرت شاہ صاحب کے عہد کے سیاسی حالات تک ہی محدود رکھنا چاہتے ہیں۔

مرہٹہ تحریک

ایک طرف پنجاب سے یہ آندھی اٹھی تھی اور بتدریج تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی سلطنت و حکومت بھی اس کے مقابلہ میں بسا اوقات اپنے کو مجبور و بے بس پاتی تھی دوسری طرف شیواجی کے دفاع نے دکن میں جو الاؤ جوڑا تھا عالمگیر کی بست ، سالہ

مسلسل کوششوں سے اگرچہ کبھی کبھی دب جاتا تھا۔ لیکن سچی بات یہی ہے اور جیسا کہ طباطبائی نے لکھا ہے کہ عالمگیر نے بذات خود دکن کی طرف رخ کیا۔ اور پورے ۲۵ سال مرہٹوں کی پامالی میں صرف کئے۔ لیکن شاہی رکاب میں جو امراء تھے۔ ان کی سستی و کاہلی سے جس میں ان کے اغراض پوشیدہ تھے معاملہ کا قطعی فیصلہ نہ ہونے پایا یا امراء اپنے ذاتی اغراض کے تحت مرہٹوں کے ہنگاموں کو ختم کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔

اورنگ زیب پنجہ فولاد کی گرفت دور ہو جانے کے بعد مرہٹوں کو نہ صرف دکن اور کوکن میں بلکہ ہندوستان کے اکثر علاقوں میں تگ و تاز اور تاخت و تاراج کا کھلا میدان مل گیا۔ "برگی" جو مرہٹہ غارت گروں کا کپکپا دینے والا نام تھا۔ اس سے ملک کے اکثر و بیشتر صوبے پامال ہو رہے تھے۔ خود دہلی پر اکثر مرہٹوں کے حملے ہوتے تھے۔ اور حکومت ان کے مقابلہ سے دن بدن اپنے کو عاجز پاتی چلی جا رہی تھی۔ مرہٹی تحریک کے مقصد اور نصب العین کے بارے میں غلام علی آزاد بلگرامی خزانہ عامرہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

لوگوں سے یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ دونوں فرقوں مرہٹہ اور کوکن برہمن کی یہ نیت ہے کہ جہاں ان کو قابو حاصل ہو جائے۔ وہاں خدا کی ساری مخلوق کے ذرائع معاش کو بند کر کے اپنی طرف ان کو سمیٹ لیں۔

زمینداری، مقدمی۔ پٹواری کا کام ان پیشوں کو بھی پرانے لوگوں کے ہاتھوں میں باقی نہیں چھوڑا ہے۔ جو بیچارے ان لوگوں کے وارث ہیں ان کی جڑ تک نکال کر انہوں نے پھینک دی۔ اور سب پر اپنا عمل دخل قائم کر لیا۔ آخر میں ان کے اندرونی منصوبے کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

"یہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ تمام روئے زمین کے مالک بن جائیں۔"

چنانچہ سیر المتاخرین میں ہے کہ جہاں کہیں آبادی انہوں نے پائی اسے جلا کر لوٹ لوٹ کر زمین کے برابر کرتے چلے گئے۔ بہر حال ایک طرف پنجاب سے سکھوں کا فتنہ تھا جو آندھی کی طرح اٹھا تھا اور اسلامی ہند کے سیاسی مطلع پر چھاتا چلا جاتا تھا۔

دوسری طرف جنوبی ہند کا مرہٹی سیلاب تھا۔ جس میں جنوب سے شمال اور مشرق سے مغرب تک کے مسلمان اپنے ڈوبنے اور بہنے کا تماشہ دیکھنے کا انتظار کر رہے تھے۔

۱۱۳۷ھ مطابق ۱۷۱۹ء میں شاہ صاحب کی عمر ۱۷ سال کی تھی کہ حسین علی خاں بالاجی وشوا ناتھ پیشوا کی سرکردگی میں گیارہ ہزار مرہٹہ فوج دہلی میں لے آیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت مرہٹے کمزور ثابت ہوئے اور بہت بڑی تعداد میں مارے بھی گئے لیکن آیندہ کے لئے ان کے واسطے رستہ کھل گیا کہ وہ مغل سلطنت کو نقصان پہنچا کر اس علاقہ میں اپنا اثر و نفوذ بڑھاتے۔ اور حملے کرتے رہیں۔

۱۱۵۴ھ تک جب کہ شاہ صاحب کی عمر تقریباً ۴۸ برس تھی مرہٹوں کا خطرہ تشویش ناک حد تک بڑھ چکا تھا۔

۱۱۵۲ھ میں باجی راؤ پیشوا کو اتنی جرأت ہوگئی کہ وہ دہلی پہنچا اور اس نے دہلی کے نواحی علاقوں کو لوٹا۔ اس کے بعد ۱۱۷۳ھ میں پھر ایک بار دلی مرہٹہ گردی کا نشانہ بنی۔

(مسلسل)

لمحات

شاہ ولی اللہؒ کی حکمت الٰہی کی یہ بنیادی کتاب ہے۔ اس میں وجود، وجود سے کائنات کے ظہور تدلی اور تجلیات پر بحث ہے۔ یہ کتاب عرصہ سے ناپید تھی۔

مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی نے ایک قلمی نسخے کی تصحیح اور تشریحی حواشی اور مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔

قیمت - دو روپے

ہماری چند بنیادی قومی خامیاں

فضل حمید

ہمارا معاشرہ روز بروز اپنے مطامح میں مادیت پرست ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم قلب و نظر کے صحیح تقاضوں سے غافل ہوگئے ہیں۔ بے نفسی و بے غرضی یعنی حسن عمل کا ہم میں فقدان ہے۔ ہم ان تمام محرکات اور عوامل و عواطف کو جو ہماری روحانی زندگی اور مکارم اخلاق کے مقتضیات ہیں، فراموش کرتے جا رہے ہیں، اسی طرح ہم نے ان اقدار کی قیمت مقابلۃً کم کردی ہے۔ جن کا تعلق علوم مجردہ یا ادب سے ہے۔ یا ان اکتسابات سے جو ذہن کو مجلا اور روح کو مصفا کرتے ہیں، لیکن براہِ راست معیشیاتی قدر و قیمت نہیں رکھتے یہی وجہ ہے کہ ایک حکیم یا ادیب کی عزت بمقابلہ ایک ماہر علوم طبیعیات کے کم ہوتی ہے۔ ان دونوں پر ایک اعلیٰ منصب دار کو فضیلت تامہ حاصل ہوتی ہے اس کی لِم یہ ہے کہ اول الذکر طبقہ کے لوگ خالصتاً ہماری روحانی و اخلاقی ضرورتوں کے کفیل ہوتے ہیں اور ثانی الذکر قسم کے لوگ ہماری مادی و معاشی ضرورتوں کے پورا کرنے میں ہماری رہبری کرتے ہیں۔ اور آخر الذکر طبقہ کے افراد ہمارے خداوندانِ مجازی یعنی صاحب اقتدار و متصرف روزگار ہوتے ہیں۔ غالبِ دیدہ ور اور نکتہ سنج نے ہمیں مادی تن پروری کے کھوکھلے پن سے جو اخلاقی سربلندی سے معرّا ہو، یوں متنبہ کیا ہے۔

ناکس ز تنومندیٔ ظاہر نہ شود کس ۔ چوں سنگِ سرِ رہ کہ گراں است و گراں نیست

ایک مثالی تصوریت اور روحانی عینیت رکھنے والے معاشرہ کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ مادیت وروحانیت کے دونوں پہلوؤں کے درمیان توازن قائم رکھے ان کی سازگاری سے ہی انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ عصر حاضر کے آلام وامراض جو انسان گیر انسانیت ہیں، اس حقیقتِ نفس الامری کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ ہماری تہذیبِ نفس اور مقاصدِ حیات کی سربلندی طبیعیاتی علوم اور فنی وصنعتی ترقی کے قدم بہ قدم اور دوش بدوش نہیں ہوئی مغرب کی میکانکی تہذیب نے اخلاقیات پر مناسب زور دینا ترک کردیا ہے اور خوب وزشت کے مابین عدم تمیز نے جائز مقاصد کے لئے جائز وسائل کے رابطہ کو غیر ضروری قرار دے دیا ہے۔ مغربی ممالک جہاں جمہوری طرز زندگی کی آزادی ہے سائنسی مادیت پرستی کے صدمہ سے ایک حد تک جاں بر ہونے میں کامیاب ہوگئے ہیں اور کلیسائی روایات کی قوت نے بعض اخلاقی وروحانی قدروں کو اس بنا پر بچا لیا ہے کہ وہ قومی سیرت وکردار کا جزو لاینفک بن چکی ہیں۔ لیکن وہ ایشیائی یا افریقی ممالک جنہوں نے اپنے ماضی کا استحقار واستخفاف یا ردّ و انکار کیا ہے اپنی ثقافتی روائتوں اور تمدنی معتقدات پر خطِ تنسیخ کھینچ رہے ہیں۔ اور اگر آج نہیں تو کل یہ نوبت ضرور آئے گی۔ باقی جو کچھ بچا ہے یا جو بچے گا وہ بے یقینی کے سوا کچھ نہ ہوگا بے یقینی تشکیک وارتیاب سے بھی بدتر ہے۔ تشکیک میں طلب حقیقت کا پہلو مضمر ہے اور عدم یقین میں بجز بے اطمینانی وبے رخی کے کیا رکھا ہے۔ نصب العین سے معرا لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے تند ہوا میں اڑتے ہوئے تنکے۔

اس سے یہ مراد نہیں کہ ہم مادی ترقی وپیش قدمی کے ناگزیر تقاضوں کو نظر انداز کردیں مادی دولت ومادی آسودگی کی تلاش انسان کے لئے ایک امر طبعی ہے۔ لیکن متمدن انسان کا مہذب ضمیر لازماً اس بات پر مصر ہے کہ ان مقاصد کے حصول کے ذرائع بھی اچھے اور حق بجانب ہوں۔ میری مراد یہ ہے کہ ہماری معاشرتی قدریں سرتاپا مادیاتی یعنی اتنی نیم انسانی خودغرضی پر مبنی نہ ہوں کہ تمام روحانی واخلاقی محرکات جو آدمی کو کم درجے کے حیوانات سے ممیز کرتے ..... ہیں، مفقود ہوجائیں۔

اگرچہ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ ہم اپنے مطامح ومقاصد اور مساعی حیات میں مغرب کی

نسبت بہت زیادہ روحانی ہیں؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہ استثنا معدودے چند نفوس کے یہ معاملہ بالعکس ہے مغرب کے خلاف یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ ان کی تہذیب اور تمدن از سرتا پا مادیاتی ہیں۔ لیکن دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ ارتفاقات النافعہ ان کے ہاں ہماری نسبت زیادہ کارفرما ہیں۔ اداراتِ خیریہ صدقاتِ جاریہ اور معاشرتی فلاح کی دوسری تحریکیں و تدبیریں ان کے سماجی اداروں اور کلیسائی نظام میں بہت نمایاں حیثیت رکھتی ہیں اس کے برخلاف ہمارے معاشرہ میں معاشرتی فلاح اور سماجی سدھار کی روح ناپید ہے۔ ہمچو من دیگرے نیست کی اور بات ہے۔ جہاں تک ہماری یاد کا تعلق ہے، ہماری مساجد کسی فلاحی یا خیراتی عزیمت کی حامل نہیں ہیں۔ یہ خارج البحث ہے کہ کسی گذرے ہوئے دور میں کیا کیا خوبیاں تھیں۔ ہمارے کروڑ پتیوں اور بڑے بڑے سرمایہ داروں کی بہت کم یہ توفیق نصیب ہوئی ہے کہ وہ اوقاف اور خیراتی ہسپتال مفت تعلیم دینے والی درسگاہوں اور دیگر اداراتِ خیریہ کا قیام عمل میں لائیں۔ ناداروں، اپاہجوں اور نابیناؤں کی دیکھ بھال کے لئے غریب خانے بنائیں یا کم از کم فاقہ کشوں کے لئے لنگر ہی جاری کردیں۔ منظم طریقہ کی خیرات تو ہمارے ہاں تقریباً مفقود ہے۔ انفرادی طور پر بعض اصحابِ خیر خیرات کرتے ہیں لیکن وہ مستحقین کے لئے قطعاً ناکافی ہے۔ خیرات کی اس رسم سے دریوزہ گری کی البتہ حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔

ہمدردی بنی نوع انسان کے جذبہ کی کمی اور صدقاتِ جاریہ کی روح کے فقدان کا سبب یہ ہے کہ ہمارا مقصود حقیقتاً مادی انتفاع اور نفس پروری ہے۔ ہم شاذ و نادر ہی کوئی ایسا کام کرتے ہیں جو ذاتی طور پر ہمارے لئے براہِ راست مفید یا شہرت کا باعث نہ ہو۔ خیرات برائے خیرات اور نیکی برائے نیکی جس کا معاوضہ فی الحقیقت خود فعل میں مضمر ہوتا ہے یعنی انعام بذاتِ خود کا مصداق ہوتا ہے۔ ایسے تصورات و مفہومات ہیں جن سے ہم بخوبی آشنا نہیں یہ تحریک کہ کسی کام کو محض اس لئے سرانجام دیا جائے کہ وہ بنفسہٖ جمیل و لطیف ہے ابھی تک ہمارے خلیات دماغی میں خوابیدہ ہے اور فعالی شعور کی جولانگاہ میں نہیں آئی۔ شاید خیالِ حسن میں حسن عمل کا خیال اس وقت پیدا ہوگا، جب قبر میں خدا کا در کھلے گا۔